علامہ فراہیؒ کی کتاب "اسالیب القرآن" -ایک تجزیاتی مطالعہ

اکرام الحق

علامہ فراہیؒ ان مفکرین و محققین میں سے ایک تھے جنھیں مبدأ فیاض نے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ خدا کی اس عظیم نعمت کا حق ادا کرتے ہوئے انھوں نے قرآنی علوم و معارف کی گراں قدر خدمت انجام دی اور طالبان قرآن کو ایسے اسرار و رموز سے آشنا کیا جن کے بغیر قرآن کا صحیح فہم، آیات کی درست تاویل اور استنباط مسائل کا مناسب حل تلاش کرنا ممکن نہ تھا۔ مولانا کو قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم پر بھی اچھی قدرت تھی اور انھوں نے اس میدان میں بھی اپنی وسعت فکر و نظر کے خوب جوہر دکھائے چناں چہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا، اس کا حق ادا کر دیا۔ لیکن ان کا اصل میدان کار قرآنیات کا موضوع تھا اور انھوں نے اپنی پوری زندگی اس میں غور و خوض اور تدبر و تفکر کے لیے وقف کر دی تھی۔ علامہ فراہی کا یہ مستحکم نظریہ تھا کہ فکر و نظر کا میدان ہو یا نظام تعلیم و تعلم، قرآن مجید کو مرکزی حیثیت دی جائے اور تمام علوم و فنون اسی کی روشنی میں پڑھے اور پڑھائے جائیں۔ نیز اسی مقدس کتاب کو اساس مان کر اس کی روشنی میں تمام علوم قدیمہ کی تجدید اور علوم جدیدہ کی تطہیر کی جائے۔ علامہ کے اس خیال کو مولانا عنایت اللہ سبحانی اس طرح بیان کرتے ہیں:

> "تصنیف و تالیف کے میدان میں یہ پہلا شہسوار ہے جس کی پہلی آواز اور آخری آرزو یہ تھی کہ قرآن پاک کو بزم علم کا صدر نشین بنایا جائے۔ مسلمانوں کے یہاں جتنے بھی علوم ہیں ان سب کا مرکز و منبع کتاب الٰہی کو قرار دیا جائے۔ اس کی روشنی میں از سرے نو سارے

علوم مدون کیے جائیں۔ وہ علوم وفنون کی ایسی دنیا بسانا چاہتے تھے
جس کے سارے سیارے آفتاب قرآن کے گرد گردش کرتے ہوں"۔[1]

یہ محض ایک فکری تخیل نہیں تھا بلکہ مولانا نے اس کا ایک قابل عمل خاکہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ چناں چہ انھوں نے مختلف علوم وفنون کا جو قرآن کے فہم میں معین ومددگار ہیں، تنقیدی جائزہ لیا اور ان کمزوریوں کی نشاندہی کی جن سے فہم قرآن کی راہ میں دشواریاں پیدا ہوسکتی تھیں۔ اس سے یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ ان علوم کو قرآن ہی کی روشنی میں از سر نو مرتب ومدون کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ فہم واستنباط سے وابستہ مسائل حل ہونے کے بجائے اور الجھتے چلے جائیں گے اور قرآن فہمی کے لیے واضح اور راہنما اصول و مبادی کی تنقیح وتنظیم میں حد درجہ دشواری پیش آئے گی۔ اس کام کو مزید تقویت پہنچانے کے مقصد سے علامہ نے مختلف قرآنی موضوعات کی طرف توجہ کی اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو بھی اپنی وسعت معلومات، مہارت فن اور دقت نظر سے بآسانی حل کردیا۔ چناں چہ 'امعان فی اقسام القرآن'، 'التکمیل فی اصول التاویل، دلائل النظام، جمهرة البلاغہ اور اسالیب القرآن جیسی مستند کتابیں ان کے اسی غور وفکر کا نتیجہ ہیں۔ مزید براں اپنے انہی اصولوں کی روشنی میں قرآن کی بعض سورتوں کی تفسیر بھی لکھی جو نظام القرآن کے نام سے موسوم ہے اور دنیا کے مختلف گوشوں میں موضوع تحقیق بنی ہوئی ہے۔

علامہ فراہیؒ کی علمی وفکری کاوشوں کا اندازہ ان کی گراں قدر تصانیف سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہاں ان کی ایک اہم کتاب "اسالیب القرآن" کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے جو مختصر ہونے کے باجود نہایت اہم ہے اور اس سے زبان وادب، بلاغت اور اسالیب قرآن کے حیرت انگیز گوشے سامنے آتے ہیں۔ علامہ فراہی نے کلام عرب اور قرآنی نظائر کے حولہ سے ان اسالیب کو اچھی طرح واضح کیا ہے تاکہ ان سے عدم واقفیت کی وجہ سے تاویل کی راہ میں جو مشکلیں پیش آتی ہیں انھیں دور کیا جاسکے۔

اسالیب کی اہمیت ہر زبان میں مسلم ہے کیوں کہ اس کے بغیر بلیغ وفصیح کلام کے محاسن تک رسائی ممکن نہیں۔ ہر زبان اپنے اندر بلاغت وفصاحت کا ایک سمندر رکھتی ہے

اور اس بلاغت کو سمجھنے کے لیے اس کے کچھ خاص اسالیب ہوتے ہیں جو ان تک رہنمائی کرتے ہیں۔ اسی طرح کسی فصیح وبلیغ کلام کے نظم وترتیب کو سمجھنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ ہم بلاغت وفصاحت کے اسالیب سے واقف ہوں چناں چہ علوم قرآن کے ایک طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ وصل وفصل، حذف وتکرار، تقدیم وتاخیر، خطاب والتفات اور ان جیسے دیگر اسالیب بیان سے بخوبی واقف ہو تاکہ کلام کے محاسن سے واقفیت بہم پہونچائی جاسکے۔

اسالیب کی اسی اہمیت کے پیش نظر علماء معانی نے اس پر بڑی توجہ صرف کی ہے اور انتہائی غور وخوض کے بعد قرآنی اسالیب تک رسائی حاصل کی تاکہ فہم قرآن کی راہ کو ہموار کیا جاسکے اور ان کی روشنی میں قرآنی معانی ومفاہیم کا تعین کیا جاسکے۔

علماء معانی نے اگر چہ اسالیب القرآن پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کے ایک ایک نکتہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن انھوں نے اس بات کی کوشش نہیں کی کہ قرآنی اسالیب کو بھی مستقل ایک فن کی حیثیت دی جائے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے علم معانی کے تحت اسالیب القرآن کو بھی شامل کرلیا ہے۔ چناں چہ علم معانی کی طرح قرآنی اسالیب کو بھی نحو کے آئینہ میں دیکھا گیا اور انھیں بھی نحو کے محدود قواعد پر پرکھنے کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے اسالیب کلام ان کی دسترس سے باہر رہے اور بیشتر پر علم معانی کے اثرات صاف طور پر نمایاں ہوئے جب کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کلام عرب جن اسالیب پر مشتمل ہے ان تمام کو نحو کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جاسکتا اور اگر ایسا کیا گیا تو نہ صرف یہ کہ کلام کا صحیح مفہوم ہاتھ سے جاتا رہے گا بلکہ اس کے محاسن کو بھی شدید صدمہ پہنچے گا۔ بعض اسالیب تو نحو کے اصول پر پورے اتر سکتے ہیں لیکن سارے اسالیب نحوی قواعد کے احاطہ میں نہیں آسکتے بلکہ ان اسالیب کو خود ان کے کلام سے اخذ کرنا ہوگا۔ اور موقع کلام یہ بتائے گا کہ اس اسلوب کے اندر مغانی ومفاہیم کے کتنے جہان پوشیدہ ہیں۔ اس لیے اگر علماء معانی نحوی قواعد کے بجائے کلام عرب پر عمیق نظر ڈالتے اور اسالیب کو خود ان کے کلام سے اخذ کرنے کی کوشش کرتے تو وہ اتنے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ ان اسالیب کی حکمتوں کو بھی

اپنے دامن میں سمیٹ لیتے جن کے فیوض وبرکات سے وہ محروم رہے ہیں۔ ذیل میں ایک مثال پیش کی جارہی ہے جس سے اس سلسلہ میں علامہ فراہی کا موقف پوری طرح واضح ہوجائے گا۔

قرآن مجید کی آیت "لئلا یعلم اهل الکتاب ان لا یقدرون علی شئی من فضل الله" (الحدید:۲۹) کے سلسلے میں علماء معانی نے بری طرح ٹھوکریں کھائی ہیں مثلاً امام زرکشی اپنی کتاب "البرهان فی علوم القرآن" میں حرف "لا" پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وتزاد بعد "ان" المصدرية، كقوله "لئلا يعلم اهل الكتاب أى ليعلم ، ولولا تقدير الزيادة لا نعكس المعنى". ۲؎

اور "ان" مصدریہ کے بعد حرف "لا" زائد ہوتا ہے جیسے لئلا یعلم اهل الکتاب" لیعلم کے معنی میں ہے۔ اور اگر "لا" زائدہ نہیں مانیں گے تو معنی الٹ جائے گا۔

پھر دلیل کے طور پر مزید کہتے ہیں:

واما زيادة "لا" فى "قوله "لئلا ليعلم اهل الكتاب" فشئى متفق عليه، قدنص عليه سيبويه ، ولايمكن ان تحمل الآية الا على زيادة "لا" فيها، لأن ماقبله من الكلام وما بعده يقتضيه. ۳؎

اور آیت "لئلا یعلم اهل الکتاب" میں "لا" کا زائد ہونا متفق علیہ ہے اور اس پر سیبویہ کا نص موجود ہے اور آیت میں "لا" کو زائدہ ماننے کے علاوہ کسی اور چیز پر محمول نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ کلام کا ماقبل ومابعد اسی کا تقاضا کرتا ہے۔

علامہ زرکشی کے اس بیان سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ علماء معانی نے اسالیب کلام کو کس طرح نحوی قواعد کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے اور جابجا غلط فہمی کے شکار ہوئے ہیں۔

مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ میں "لا" زائد نہیں ہے بلکہ اس کے

ذریعہ اس مفہوم کی طرف اشارہ کردیا گیا ہے جو صراحتاً آیت میں موجود نہیں لیکن متبادر ضرور ہوتا ہے۔ اور اس "لا" کو اسی مفہوم کے بدل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے ایجاز کا فائدہ بھی حاصل ہوگیا اور بآسانی اصل مفہوم تک رسائی بھی ہوگئی۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اہل کتاب یہ نہ سمجھیں کہ اللہ کا فضل ان کے قبضے میں ہے، ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ وہ تو اللہ کے کسی بھی فضل پر قادر نہیں۔ لیکن اسلوب کی یہ دل کشی اس وقت ان پر عیاں ہوتی جب وہ خود کلام عرب سے استفادہ کرتے۔ علامہ فراہی کے الفاظ یہ ہیں:

إن "لا" فى قوله تعالىٰ (لئلا يعلم اهل الكتاب ان لايقدرون على شئى من فضل الله) ليست بزائدة إنما السر فى "ان" .إنها بيان لما لم يذكر وعوض منه كانه قيل "لئلا يعلم اهل الكتاب ان فضل الله بايديهم كلاإنهم لايقدرون على شئى من فضل الله". ۴؎

علماء معانی کی انہیں لغزشوں کی وجہ سے علامہ فراہی نے اسالیب القرآن کو مستقل ایک فن کی حیثیت سے پیش کیا، مولانا کا ماننا تھا کہ قرآن کا اعجاز صرف اس پہلو سے نہیں ہے کہ اس کا کلام نحو کے اعلیٰ قواعد پر مشتمل ہے اور الفاظ کا استعمال اس مناسبت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ ہر لفظ جامعیت ومعنویت میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا بلکہ اس کا اعجاز اس پہلو سے بھی ہے کہ اس میں تراکیب کلام اور اسالیب بیان ان خصوصیات وامتیازات پر مشتمل ہیں جو کسی ارفع واعلیٰ کلام ہی کا حصہ ہے، لہٰذا یہ بات اس کی متقاضی ہوئی کہ اسالیب قرآن کو بھی مستقل فن کی حیثیت دی جائے جس طرح دیگر علوم قرآنیہ کو مستقل حیثیت حاصل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی اہمیت قرآن کے دوسرے اعجازی پہلوؤں سے کم نہیں حتی کہ بعض دفعہ نظم قرآن کو بھی اسالیب کے تابع ہونا پڑتا ہے۔

گو کہ علامہ فراہی سے قبل بھی قرآنی اسالیب پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور علماء معانی نے اس پر کافی توجہ بھی صرف کی ہے تاہم اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ علامہ فراہیؒ نے جس دقت نظر اور نکتہ سنجی سے ان اسالیب کو کلام عرب، قرآن مجید اور صحف

قدیمہ کی روشنی میں جانچا اور نحوی قواعد پر لکھے گئے اصولوں کو ان کی محدود بندش سے نکال کر انھیں ان کا اصل مقام دیا ہے نیز ان پر بہت کچھ مزید اضافہ کرکے اسے مستقل ایک فن کی حیثیت دی یہ صرف علامہ فراہیؒ کا امتیاز ہے اور بجائے خود ایک بڑے کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔

چوں کہ علامہ فراہیؒ نے اس کتاب کو صرف قرآن کے اسالیب بیان کرنے کے لیے خاص نہیں کیا تھا بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ کتاب تمام کلاب عرب پر مشتمل ہو۔ کیوں کہ کلام عرب کے اسالیب اور ان کے مواقع استعمال سے ناواقفیت کی صورت میں اسالیب قرآن تک رسائی ناممکن ہے، اسی لیے ضروری ہوا کہ کلام عرب کو سامنے رکھ کر اسالیب بیان اخذ کیے جائیں اور پھر اسی کی روشنی میں قرآنی اسالیب کو سمجھا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''ھذا الکتاب لیس ککتاب المفردات مختصا بالقرآن ولکنه متضمن لفن براسه یجری حکمه فی عموم اسالیب کلام العرب غیر مااختص بالقرآن. ۵

یہ کتاب ''مفردات'' کی طرح قرآن کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ یہ مستقل ایک فن ہے۔ قرآن کے ساتھ خاص ہونے کے بجائے تمام کلام عرب پر اس کا اطلاق ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا نے اس کتاب کا نام اسالیب القرآن رکھنے کے بجائے ''کتاب الاسالیب'' تجویز کیا تھا لیکن پروانۂ اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اس منصوبہ کی تکمیل کرسکتے پھر بھی اس سلسلہ میں وہ جتنا کچھ کرسکے تھے اس سے فہم قرآن کی راہ میں حائل بہت سی مشکلات کو حل کیا جاسکتا ہے۔ جامع کتاب مولانا بدرالدین اصلاحی اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فان ھذا مجموع من الاشارات التی اختزنھا استاذنا الامام الفراھی لکتابه الاسالیب. ۶

یہ کتاب استاذ امام فراہیؒ کے ان اشارات کا مجموعہ ہے جوانھوں نے اپنی کتاب ''کتاب الاسالیب'' کے لیے جمع کیے تھے۔

گزشتہ سطور میں یہ بات آچکی ہے کہ علماء معانی نے اسالیب القرآن کو محض نحوی قواعد پر پرکھنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں بیشتر اسالیب ان کی دسترس سے باہر رہے اور بہت سے مقامات پر غلط فہمی کے شکار ہوئے۔ اس لیے علامہ فراہیؒ نے اپنی اس کتاب میں صرف ان اسالیب کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جن سے یا تو اصولیین نے تعرض ہی نہیں کیا تھا یا ان میں خطا کی تھی، تاکہ فہم قرآن کی راہ آسان ہو چنانچہ لکھتے ہیں:

من الاسلوب ماشارک القرآن کلام العرب فھذا لانستقصیه ولکن نذکر مایجب ذکره مما ترکه الناس أو أخطأ وافیه والعلم به نافع فی فھم القرآن. ۷

وہ اسلوب جن میں قرآن مجید اور کلام عرب میں مشارکت پائی جاتی ہے ہم اس کا استقصا نہیں کریں گے بلکہ ہم اس کا ذکر کریں گے جس کا ذکر کرنا ناگزیر ہے جسے اصولیین نے چھوڑ دیا ہے یا جس میں غلطی کی ہے اور یہ علم فہم قرآن کے لیے نفع بخش ہے۔

علامہ فراہیؒ نے اپنی کتاب میں جن اسالیب پر گفتگو کی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱-القرآن والوصل ۲-الخطاب والالتفات ۳-الحذف ۴-العود علی البدء ۵-التفصیل بعد الاجمال ۶-الاقتصار علی بعض الشئی ۷-ذکر الاثر لما یخفی ۸-وجوه الوصل والفصل ۹-اختلاف الاسالیب فی الخطاب ۱۰-الاعتراض ۱۱-استعمال اسلوب عوض اسلوب ۱۲-الزیادة ۱۳-الاستفھام ۱۴-الشرط ۱۵-الفصل بین الفصلین ۱۶-استعمال الحال ۱۷-الاثبات ۱۸-النفی ۱۹-التکرار ۲۰-البدل ۲۱-الوصف ۲۲-التنکیر والتعریف ۲۳-العطف بالواؤ ۲۴-الترديد ۲۵-التقدیم والتاخیر ۲۶-التخلیص ۲۷-التعمیم والتخصیص ۲۸-اختلاف الصلة والفعل ۲۹-المقابلة والتفصیل ۳۰-اختلاف الوضاحة علی التقابل ۳۱-الابھام ثم الایضاح ۳۲-تضمن القول دلیله.

اس مختصر سے مقالے میں ان تمام اسالیب کا تفصیلی جائزہ لینے کی گنجائش نہیں

البتہ چند اہم اسالیب کی وضاحت پیش کی جارہی ہے جس سے کتاب کی قدر و قیمت متعین کرنا ممکن ہو سکے گا۔

اسلوب التفات

یہ قرآنی اصول خطاب کی ایک قسم ہے۔ یہ اسلوب قرآن مجید اور کلام عرب میں عام ہے۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق ہے اور سب سے خطاب کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے اس کے مخاطبین بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں چناں چہ کبھی وہ جمیع عوام سے خطاب کرتا ہے تو کبھی کسی خاص جماعت سے، کبھی مسلمانوں سے تو کبھی کفار و مشرکین سے، اسی لیے قرآن میں اس اسلوب کا استعمال بکثرت ہوا ہے۔ علامہ فراہیؒ نے اس مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

كأن القرآن خطيباً سماويا يخاطب اهل الارض كافة فيلتفت يمينا وشمالا ويخاطب هذا وذاك وهذا كثير في القرآن۔[8]

گویا کہ قرآن ایک آسمانی خطیب کی شکل میں کھڑا ہے جو پوری دنیا کے لوگوں سے خطاب کرتا ہے۔ کبھی وہ دائیں مڑتا ہے تو کبھی بائیں، کبھی ان سے مخاطب ہوتا ہے اور کبھی اُن سے اور قرآن میں اس کا استعمال بہت ہے۔

گو کہ یہ اسلوب عام ہے لیکن انتہائی غور و فکر کا محتاج ہے، اس سے عدم واقفیت کی وجہ سے بہت سے مفسرین کو تاویل آیات میں بڑی غلطی ہوئی ہے اور مقصود کی تعیین میں زحمت پیش آئی مثلاً آیت کریمہ "وان منکم الا واردها کان علی ربک حتما مقضیا" (مریم: ۷۱) کے بارے میں بہت سے مفسرین نے یہ سمجھا کہ یہاں خطاب عام ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ مومن و کافر دونوں کو جہنم سے گزرنا ہے۔ اس مفہوم کی تعیین میں انھوں نے ماقبل آیت "اولا یذکر الانسان انا خلقنہ من قبل ولم یک شیئا" (مریم: ۶۷) کی روشنی میں لفظ "انسان" سے یہ سمجھا کہ یہاں خطاب عام ہے

لیکن ماقبل و مابعد کی آیات میں تعلق پیدا کرنے کی سعی ناکام میں اسلوب التفات کا سررشتہ ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور آیت کا یہ مفہوم بیان کر دیا کہ "ہر ایک کو جہنم سے گزرنا ہے" اپنی اس تاویل کی تائید میں انھوں نے اس حدیث کو بھی دلیل بنایا جس میں یہ مضمون ہے کہ "قیامت کے دن ایک پل صراط نصب کیا جائے گا اور ہر ایک کو اس پر سے گزرنا ہوگا" حالاں کہ یہ حدیث روایتاً و درایتاً دونوں اعتبار سے ناقابل استدلال ہے لیکن مفسرین نے اس کے نتائج سے صرف نظر کرتے ہوئے اس سے استدلال کیا اور اس طرح آیت کا وہ مفہوم سامنے آیا جو خود قرآن سے معارض تھا جب کہ اسلوب التفات کو ملحوظ رکھا جاتا تو کلام کی روح بھی باقی رہتی اور آیت کا صحیح مفہوم بھی کھل کر سامنے آجاتا چناں چہ اس تناظر میں اگر آیت پر غور کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اوپر کی آیات میں منکرین قیامت کے متناقض خیالات کی تردید کی گئی ہے، اس کے بعد پوری تاکید کے ساتھ قسم کھا کر یہ فرمایا گیا کہ ایسے تمام لوگ اپنے گمراہ کن لیڈروں کے ساتھ جہنم کے ارد گرد اس طرح اکٹھا کیے جائیں گے کہ وہ مجرموں کی طرح دوزانو بیٹھے اپنے فیصلہ کا انتظار کریں گے اور پھر سب کو جہنم میں ان کے مراتب کے اعتبار سے داخل کر دیا جائے گا یہ تمام باتیں بصیغہ غائب کہی گئی ہیں اور پھر اس کے بعد انھیں مجرمین کو مخاطب بنا کر کہا گیا کہ یہ امر بالکل قطعی اور فیصل شدہ ہے کہ تم سب کو واصل جہنم ہونا ہے۔ یہ محض اسلوب کی تاثیر ہے کہ تھوڑی دیر میں پہلے جو غائب تھے، اب وہ مخاطب بن گئے۔ یہ اسلوب شدت عتاب اور شدت غضب پر دلیل ہوتا ہے جس طرح غائب کا اسلوب عدم التفات پر دلیل ہوتا ہے۔ اگر یہ مراد لیتے ہیں کہ "تمام لوگ اس میں پڑیں گے یا اس کے اوپر سے گزریں گے خواہ مومن ہوں یا کافر تو اللہ تعالیٰ کے اس قول کا کیا مطلب ہوگا؟

إن الذين سبقت لهم منا الحسنى اولئك عنها مبعدون لا يسمعون حسيسها. (الانبیاء: ۱۰۱-۱۰۲)

البتہ جن لوگوں کے لیے اچھے انجام کا ہماری جانب سے وعدہ ہو چکا ہے، وہ اس سے دور رکھے جائیں گے، وہ اس کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے۔

اور یہ آیت بھی اس کے مخالف ہے:

وهم من فزع يومئذ آمنون

اور وہ اس دن گھبراہٹ سے مامون رہیں گے۔ (النمل: ۸۹)

تاویل کی اس قسم کی غلطیوں سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ اسالیب قرآن پر بھرپور توجہ دی جائے۔

زیر بحث کتاب میں افادات فراہی کے ضمن میں اسلوب التفات کی ایک نادر قسم کی طرف اشارہ ملتا ہے جو کسی بھی مفسر کے یہاں نہیں پائی جاتی حتی کہ فکر فراہی کے سب سے بڑے شارح اور ترجمان مولانا امین احسن اصلاحی بھی اس باب میں دیگر مفسرین ہی کے ساتھ ہیں۔

علامہ اس نادر قسم کا تعارف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

'من الالتفات نوعٌ يوهم من الحذف ولكن من الالتفات۔[9]

التفات کی ایک قسم ہے جسے حذف کی قبیل سے سمجھا جاتا ہے جب کہ وہ التفات ہی کی قبیل سے ہے۔

علامہ نے اپنے اس دعوے کی دلیل میں قرآنی آیت کو پیش کیا ہے:

فويل يومئذ للمكذبين الذين هم في خوض يلعبون يوم يدعون الى نار جهنم دعا هذه النار التي كنتم بها تكذبون افسحر هذا ام انتم لا تبصرون (الطور: ۱۱-۱۵)

پس بدبختی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی، ان کی جو سخن گستری میں لگے ہوئے کھیل رہے ہیں جس دن کہ وہ آتش دوزخ کی طرف دھکے دے دے کر لے جائے جائیں گے۔ کہ یہ وہ دوزخ ہے جس کو تم جھٹلا رہے تھے۔ کیا یہ جادو ہے یا تمہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

علامہ فراہی کے اصول کے مطابق آیت کریمہ میں "هذه النار التي كنتم بها تكذبون" سے قبل کوئی لفظ یا جملہ محذوف نہیں بلکہ یہ التفات ہی کی ایک قسم ہے۔ دیگر

مفسرین کے یہاں یہ اسلوب موجود نہیں۔ مثلاً اس آیت کے متعلق علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

(هذه النار التي كنتم بها تكذبون) اي يقال لهم ذلك يوم يدعون الى نار جهنم دعا اي هذه النار التي تشاهدونها هي النار التي كنتم تكذبون بها في الدنيا والقائل لهم بهذه المقالة هم خزنة النار۔[10]

"هذه النار التي كنتم بها تكذبون" یہ ان سے اس دن کہا جائے گا جب وہ دھکے مار مار کر جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے یعنی (یہ کہا جائے گا) یہ جہنم جس کا تم مشاہدہ کر رہے ہو وہی جہنم ہے جس کو تم دنیا میں جھٹلاتے تھے اور یہ بات ان سے جہنم کے داروغہ کہیں گے۔

اسی طرح مولانا مودودیؒ رقم طراز ہیں:

جس دن انھیں دھکے مار مار کر جہنم کی طرف چلایا جائے گا اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔[11]

اور فکر فراہیؒ کے ترجمان مولانا امین احسن اصلاحی یوں فرماتے ہیں:

"اور ان سے کہا جائے گا" یہ ہے وہ دوزخ جس کا دنیا میں تم مذاق اڑاتے اور جس کو جھٹلاتے تھے۔[12]

جیسا کہ مفسرین کے اقوال سے ظاہر ہے کہ وہ تمام کے تمام اس پر متفق ہیں کہ یہ حذف کی قبیل سے ہے یعنی اس سے پہلے "قيل لهم، يقال لهم" یا ایسا ہی کوئی جملہ محذوف ہے۔ دراصل مفسرین کو یہ غلط فہمی اس وجہ سے پیش آئی کہ انھوں نے یہ سمجھا کہ آیت میں مخاطب کے سامنے آخرت پیش آنے والے مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے تا کہ چشم بصیرت سے وہ اس خوفناک منظر کو دیکھ لے تو شاید اپنے منکرانہ طرز عمل سے باز آجائے جب کہ خود مخاطب مستقبل میں موجود نہیں لہٰذا اس صورت میں التفات کیوں کر مناسب ہوسکتا ہے؟

علامہ فراہی نے قرآن کریم اور کلام عرب کی روشنی میں جو اسلوب پیش فرمایا ہے

اگر اسے سامنے رکھا جائے تو آیت کا یہ ٹکڑا بھی حذف نہیں بلکہ التفات کے قبیل سے ہوگا اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ حال کے آئینہ خانے میں مستقبل کی تصویر پیش کی گئی اور قیامت کا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے لایا گیا تا کہ چشم تصور سے وہ اس المناک منظر کا نظارہ کرلیں۔ جب مخاطب پوری طرح مستقبل کی دنیا میں سیر کرنے لگا تو اس صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اسی عالم میں خطاب کیا گیا، اس کا فائدہ جہاں یہ ہوا کہ اس نے چشم تصور سے ماوراء کائنات کی ہولنا کیوں کا مشاہدہ کیا، وہیں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان حقائق کے مشاہدہ کے فوراً بعد انھیں مخاطب بنا کر سیدھے لفظوں میں یہ اعلان کردیا گیا کہ تمہارا جرم بھی نا قابل معافی ہے اور اسی جہنم میں تمہیں بھی داخل ہونا ہے۔ اس طرح اسلوب التفات کے ذریعہ شدت غضب وعتاب اور زجر وتوبیخ میں غیر معمولی شدت کا تاثر پیدا ہوگیا چناں چہ زور کلام کی اسی حکمت کے پیش نظر آگے بھی انھیں اسی طرح خطاب کیا گیا تا کہ مخاطب کو پوری طرح سے مبہوت کردیا جائے اور اس کی اصل حقیقت بے پردہ کردی جائے۔

لیکن اگر اسے التفات نہ مان کر حذف فرض کریں تو نہ صرف یہ کہ زور کلام متاثر ہوگا بلکہ کلام کی روح اور اس کے محاسن کو بھی شدید صدمہ پہنچے گا چناں چہ علامہ فراہی بالکل واضح طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ:

ولم یحذف قبلہ "قیل لہ"[۱۳۱] — اور اس سے پہلے "قیل لہ" کے الفاظ محذوف ہیں۔

التفصیل بعد الاجمال:

قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ وہ بعض مقامات پر اجمال سے کام لیتا اور بعض جگہ تفصیل سے بالخصوص جب وہ عربوں سے خطاب کرتا ہے تو ایجاز کو پسند کرتا ہے اس لیے کہ وہ کلام میں اشارہ، کنایہ، حذف اور اختصار کا استعمال زیادہ کرتے تھے اور اسی کو کلام کی معراج سمجھتے تھے اور جب اس کا روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہوتا ہے تو تفصیل

سے کام لیتا ہے۔

یہ اسلوب کلام عرب ہی میں نہیں بلکہ ہر زبان میں پایا جاتا ہے نیز یہ اسلوب دعوتی اعتبار سے اپنے اندر بڑی خوبیاں رکھتا ہے کیوں کہ ابتداء میں کسی دعوت کو پیش کرنے کا سب سے حکیمانہ طریقہ یہی ہے کہ جزئیات کے بجائے کلیات کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے اور پہلے اصولی و بنیادی باتیں جامع اور موثر جملوں میں مختصراً بیان کی جائیں تا کہ آدمی کا ذہن اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے ہموار ہو، پھر جب ذہن مزید تعلیمات قبول کرنے کے لیے تیار ہوجائے تو جزئیات وتفصیلات کی دعوت دی جائے۔ ورنہ اگر کلیات ومبادی کو اس کے ذہن میں مستحکم ومتحضر کیے بغیر شروع ہی میں تفصیل کا سہارا لیا جائے گا تو آدمی اسی میں الجھ کر رہ جائے گا اور دین کی اصل تعلیم اس تک نہیں پہنچ سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں جب اہل مکہ کو اسلام کی دعوت دی گئی تو انھیں جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر کلیات کی طرف بلایا گیا چناں چہ ابتدائی دور کی نازل شدہ مکی سورتیں اس کی واضح اور روشن دلیل ہیں۔

یہ اسلوب قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے مثلاً سورہ انعام میں آیت ۱۱۸-۱۲۱ کے درمیان مشرکین مکہ کی ان بدعات کی تردید کی گئی جو اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت انھوں نے تحریم وتحلیل کی نوعیت کی ایجاد کی تھیں پھر بعد کی آیات میں ان بدعات کی تفصیل اس طرح پیش کی گئی:

وقالوا هذه انعام وحرث حجر لا يطعمها الا من نشاء بزعمهم وانعام حرمت ظهورها وانعام لا يذكرون اسم الله عليها افتراء عليه سيجزيهم بما كانوا يفترون (الانعام: ۱۳۸)

اور کہتے ہیں فلاں فلاں چوپائے اور فلاں فلاں کھیتی ممنوع ہے۔ ان کو نہیں کھا سکتے مگر وہی جن کو ہم چاہیں، اپنے گمان کے مطابق اور کچھ چوپائے ہیں جن کی پیٹھیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں۔ اور کچھ چوپائے ہیں جن پر خدا کا نام نہیں لیتے، محض اللہ کے اوپر افتراء کے طور پر اللہ عنقریب ان کو اس افتراء کا بدلہ دے گا۔

اسی طرح قصہ موسیٰ میں فرمایا گیا: نتلوا علیک من نبأ موسیٰ بالحق. (القصص:۳) اس کے بعد تفصیل شروع ہوئی۔ قصہ آدم میں اولاً صرف اتنا کہا گیا: ولقد عهدنا الیٰ آدم من قبل فنسی ولم نجد له عزما. (طٰہ:۱۱۵) پھر اس کے بعد۔ واذقلنا للملائکة سے پورا قصہ بیان ہوا۔

واقعہ یوسف میں پہلے اجمالاً فرمایا گیا: نحن نقص علیک احسن القصص (یوسف:۳) پھر اس کی تفصیل شروع کی گئی۔ اس طرح اجمال کے بعد تفصیل کے ساتھ پورا واقعہ بیان ہوا ہے۔

اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی طرز اسلوب کی وجہ سے مخاطب اکتاہٹ اور بددلی کا شکار ہوسکتا ہے لیکن جب گوناگوں اور متنوع اسالیب استعمال ہوتے ہیں تو آزردگی اور بددلی کافور ہوجاتی ہے اور قاری ہر وقت اپنے آپ کو نشیط وتازہ محسوس کرتا ہے۔ نیز عدم تفصیل آدمی کو اپیل کرتی ہے کہ پہلے خود ان حقائق ومعارف میں غور کرے اور متکلم کے اصل منشاء کو جاننے کی کوشش کرے کیوں کہ جب اس کی تفصیل بیان کردی جائے گی تو کم فہم لوگ بھی ان مسائل کو اچھی طرح سمجھ لیں گے جو اجمال کی صورت میں نہیں سمجھ سکے تھے۔ علامہ فراہی فرماتے ہیں:

ومنها: أن القاصر الفهم یفهم مالم یفهمه اولا وهذا یشبه تکرار القول.[۱۴]

اور اس کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ کم فہم اس چیز کو سمجھ لیتا ہے جو پہلے نہیں سمجھ سکا تھا اور یہ تکرار کے مشابہ ہے۔

عود علی البدء:

قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب یہ بھی ہے کہ وہ ایک مضمون کو بیان کرتا ہے لیکن درمیان میں کسی خاص مناسبت کی وجہ سے کچھ اور باتوں کا ذکر شروع کردیتا ہے۔ اس کے بعد پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کرلیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ اصل امر کی تاکید ہوتی ہے اور اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ وہی اسلوب ہے جو کسی اعلیٰ خطیب کے اندر

پایا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی بات شروع کرتا ہے تو بطور تمہید اصل موضوع کی طرف توجہ دلاتا ہے پھر درمیان میں اس کے عوارض ولوازمات سے بحث کرتا ہے اور جب خاتمہ کا وقت آتا ہے تو پھر اسی اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہے۔ اس کا مقصود اسی اصل مضمون کی تاکید اور اہمیت کا پتہ دینا ہوتا ہے۔ چوں کہ قرآن بھی ایک آسمانی خطیب ہے اس لیے اس کے اندر بھی یہی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ چناں چہ قرآن مجید میں یہ اسلوب بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا:

یابنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم واوفوا بعهدی اوف بعهدکم وایای فارهبون. (بقرہ:۴۰)

اے بنی اسرائیل ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی، میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا اسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ ہے میں پورا کروں گا اور مجھ ہی سے تم ڈرو۔

پھر درمیان میں اس کے عوارض ولوازمات سے بحث کرتے ہوئے چند باتوں کا تذکرہ کیا گیا اور اس کے بعد کلام اصل موضوع کی طرف مڑ گیا۔

یابنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم وأنی فضلتکم علی العالمین. (بقرة:۴۷)

علامہ فراہی اپنی تفسیر میں اس اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اعلم ان هذه الجملة مشتملة من اسالیب البیان ... الرجوع الی الاساس.[۱۵]

جان لو کہ یہ جملہ رجوع الی الاساس (عود علی البدء) کے اسلوب پر مشتمل ہے۔

آیت کی تفصیل کے دوران اس اسلوب کو مزید واضح فرمادیا ہے:

واعلم انه تعالی کما بدأ بذکر الأصل فکذلک ختم به وذلک لیعلموا ان المطلوب هو الایمان الصالح وبعبارة اخری الشکر والتقوی لا محض التسمیة بدین خاص.[۱۶]

اور یہ اچھی طرح جان لو کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اصل چیز کے ذکر سے ابتداء کی اسی طرح اس پر اختتام کیا تاکہ وہ (بنو اسرائیل) جان لیں کہ مطلوب ومقصود ایمان صالح ہے اور دوسرے لفظوں میں شکر وتقویٰ نہ کہ کسی خاص دین کے نام سے موسوم ہونا۔

اسی طرح سورہ مومنون میں پہلے ایمان والوں کی ایک صفت نماز کا تذکرہ ہوا پھر درمیان میں چند اور صفات بیان کی گئیں اور آخر میں صفت نماز ہی پر کلام کا خاتمہ ہوا۔ اس طرح جو مضمون پہلے بیان ہو چکا تھا اس کے اعادے کے ساتھ اختتام کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کی اہمیت واضح ہوگئی چوں کہ نماز ہی دین کا ستون ہے اور اس کے ترک کرنے سے دین کی عمارت ڈھ سکتی ہے، اس لیے اسے پورے اہتمام کے ساتھ بیان کیا گیا۔

علامہ فراہی کا پیش کردہ یہ اصول علماء معانی کے یہاں نہیں پایا جاتا۔ شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے اسالیب کو خود کلام عرب سے نہیں اخذ کیا کیوں کہ اگر وہ اپنے سامنے کلام عرب اور قرآن مجید کو رکھتے تو ایسے روشن اسلوب پر ان کی نگاہ ضرور پڑتی جو اپنے اندر پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اس طرح مفسرین کے یہاں بھی یہ اسلوب مفقود ہے البتہ بعض مفسرین کے یہاں اس کی طرف کسی قدر اشارہ ملتا ہے لیکن کہیں کہیں وہ بھی اس اسلوب کو نظر انداز کر جاتے ہیں یا ان کا ذہن اس جانب منتقل نہیں ہو پاتا جس کی وجہ سے آیات کے درمیان ربط پیدا کرنے اور اس کی صحیح تاویل پیش کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ علامہ فراہیؒ نے نہ صرف یہ کہ اس اسلوب کو کلام عرب اور قرآن مجید کے ایک معروف اسلوب کے طور پر پیش کیا بلکہ نظم قرآن کے فہم میں اس کے استعمال کو ضروری قرار دیا۔

حذف

حذف قرآن مجید کا ایک اہم اسلوب ہے اور علامہ فراہی نے جس قدر تفصیل سے اس اسلوب پر بحث کی ہے، کسی دوسرے پر نہیں کی، اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر مفسرین حذف کے قائل تو ہیں لیکن بعض مقامات کو چھوڑ کر حذف کو کلام کی ایک خامی تصور کرتے ہیں۔

قرآن میں فصاحت و بلاغت کے تقاضوں کے تحت محذوفات بکثرت پائے جاتے ہیں، چوں کہ قرآن عرب کی زبان میں نازل ہوا اور اہل عرب اپنی ذہانت و فطانت

اور قدرت کلام میں مشہور تھے اور ایجاز کو پسند کرتے تھے، اس لیے قرآن نے بھی ان کے سامنے کلام کو حذف کے ذریعہ موثر اور بلیغ بنا کر پیش کیا تاکہ یہ عین ان کے ذوق و مزاج کے موافق ہو۔

علامہ فراہی نے اپنی کتابوں میں عرب کے اس امتیاز کو کہ وہ اپنی فطری ذہانت و طباعی اور قادر الکلامی کی وجہ سے تمام اقوام عالم سے ممتاز اور نمایاں ہیں اور ان کے نزدیک کلام کی معراج یہی ہے کہ وہ حشو و زوائد سے پاک ہو، متعدد دلائل سے ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ کلام کے ان اجزاء کو بے تکلف حذف کر دیتے ہیں جنھیں مخاطب بادنیٰ تامل سمجھ جائے۔

علامہ فراہی نے اپنی کتاب ''اسالیب القرآن'' میں تقریباً تیرہ اصول پیش کر کے اس اسلوب کو واضح کیا ہے، درج ذیل سطور میں ان کے پیش کردہ چند اصول کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اس باب میں ان کا موقف سامنے آسکے۔

ومنها حذف جانبين من المتقابلين كما دل عليه مقابله. [۱۷]

اور مواقع حذف میں یہ بھی ہے کہ دونوں مقابل کے ایک ایک پہلو کو ایک دوسرے کی دلالت کی وجہ سے حذف کر دیا جائے۔

بطور مثال قرآن مجید کی آیت ''جعل لكم الليل لتسكنوا فيه والنهار مبصرا ''۔ (یونس: ۶۷) کو پیش کیا ہے۔ اس میں مولانا فراہی کے اصول کے مطابق ''متقابل اجزاء کو حذف کر دیا گیا ہے اور مذکورہ جزو، محذوف کی طرف اشارہ کر رہا ہے''۔ حذف کو کھولنے پر آیت یوں ہوگی کہ ''جعل الليل مظلما لتسكنوا فيه والنهار مبصرا لتبتغوا فيه ''۔ اس اسلوب کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے کلام میں خوبی و دل کشی اور اس کی قوت تاثیر میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ مزید براں قاری کو کلام میں اپنی قوت تخیل سے کام لینے کا پورا پورا موقع ملتا ہے۔

اسی طرح علامہ نے حذف کے مواقع میں حذف جواب شرط کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے کہ بہت سے مقامات پر شرط مذکور ہے لیکن

جواب شرط حذف کردیا گیا ہے مثلاً

إذا لمجرمون ناکسوا رؤوسهم عند ربهم ...... (السجدة: ۱۲)

ولو ترى إذ فزعوا فلا فوت...... (السبا: ۵)

ولو ترى إذ وقفوا على النار...... (الانعام: ۲۷)

ان تمام آیات میں شرط مذکور ہے لیکن جواب شرط حذف کردیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ایسے مقامات پر جواب شرط کا محذوف ہونا ہی زیادہ بلیغ اور موثر ہے، اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جو بات کہی جاتی ہے وہ اگر نفع بخش اور خوش کن بات ہے تو اس کا محذوف ہونا اس کی اہمیت وعظمت کو اجاگر کرے گا اور اگر اس کا تعلق کسی وعید یا عتاب سے ہے تو اس کا ذکر نہ کرنا اس کی شدت وہیبت کو مزید ابھارے گا یعنی یہ اس بات کا اعتراف ہوگا کہ یہ اس قدر خوفناک اور شدید ترین چیز ہے جس کی تعبیر لفظوں میں ممکن نہیں۔

مندرجہ بالا آیات پر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حذف جواب شرط کے ذریعہ اس کی اہمیت وشدت اور تاکید میں کس قدر اضافہ ہوگیا ہے اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حذف کے ذریعہ سامع کے ذہن کو جن خیالات وتصورات کی طرف موڑنا مطلوب ہے، الفاظ اس کے متحمل نہیں ہوسکتے اور اگر ان خیالات وتصورات کو الفاظ کا پیکر دینے کی کوشش کی جائے تو یقینی ہے کہ کما حقہ ان مناظر کی تصویر کشی نہیں ہوسکتی۔ لہذا جواب شرط کو محذوف رکھنے ہی میں کلام کی بلاغت وفصاحت کا راز پوشیدہ ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ عنایت اللہ سبحانی، علامہ حمید الدین فراہی، ایک عظیم مفسر، ایک مایہ ناز محقق، ایک بلند مجدد، مکتبۃ الاصلاح، سرای میر، ۱۹۷۸، ص ۱۱۶

۲۔ امام بدرالدین محمد بن عبداللہ زرکشی، البرھان فی علوم القرآن، مکتبہ دارالتراث القاہرہ، جلد ۳، ص ۷۸

۳۔ حوالہ سابق

۴۔ الامام عبدالحمید الفراہی، رسائل الامام الفراهی فی علوم القرآن، مکتبہ دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرای میر، ۱۹۹۱، ص ۱۵۵

۵۔ حوالہ سابق

۶۔ حوالہ سابق

۷۔ حوالہ سابق

۸۔ حوالہ سابق

۹۔ حوالہ سابق، ص ۱۶۷

۱۰۔ محمد بن علی الشوکانی، فتح القدیر، دارالفکر، بیروت، ۱۴۰۳/۱۹۸۳، الجزء الخامس، ص ۹۵

۱۱۔ ابوالاعلی مودودی، تفہیم القرآن، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۸۸، جلد ۵، ص ۱۶۶

۱۲۔ امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، تاج کمپنی دہلی، ۲۰۰۱، جلد ۸، ص ۲۳

۱۳۔ رسائل الامام الفراهی فی علوم القرآن، ص ۱۶۷

۱۴۔ حوالہ سابق، ص ۱۷۸

۱۵۔ الامام عبدالحمید الفراہی، تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان (سورۃ البقرۃ)، الدائرۃ الحمیدیۃ، ۱۴۲۰/۲۰۰۰، ص ۲۶۰

۱۶۔ حوالہ سابق، ص ۱۷۵

۱۷۔ رسائل الامام الفراهی فی علوم القرآن، ص ۱۷۵

☆